مسئلۂ قُبرُص[1]

خلیل حامدی

[پچھلے شمارے میں ہم نے ترکی کے بارے میں چند گزارشات پیش کی تھیں۔ اب ہم ترکی کے سب سے بڑے مسئلہ کا اُس کے تاریخی پس منظر کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔ قُبرُص کا مسئلہ ترکی کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو پاکستان کے لیے کشمیر کی حیثیت ہے۔ بلکہ ترکی کو بھی قُبرُص اور یونان کے غنڈوں اور ہٹ دھرم رہنماؤں سے اسی طرح سابقہ درپیش ہے جیسا پاکستان کو کشمیر کے جن سنگھیوں اور بھارت کے مکار حکمرانوں سے ہے۔]

بخاری اور مسلم میں مذکور ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اُمّ حرام دالرمیصاء رضی اللہ عنہا کے گھر میں دوپہر کو خوابِ راحت فرما رہے تھے کہ ہنستے ہوئے بیدار ہوئے۔ اُمّ حرام نے عرض کیا: کیا حضور میری کسی بات پر ہنسی فرما رہے ہیں؟ آنجناب نے فرمایا: مجھے خواب میں اپنی امّت کا وہ گروہ نظر آیا ہے جو اسلامی فتوحات کی خاطر سمندر کو چیر رہا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے گویا بادشاہ تختوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت اُمّ حرام نے اس گروہ کی عظمت اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسرت دیکھ کر عرض کیا: یا رسول اللہ، دعا فرمائیں اللہ مجھے بھی اس مبارک گروہ میں شامل کرے۔ آپؐ نے فرمایا: تم سب سے پہلی فوج میں ہوگی۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب اور

---

[1] قُبرُص (رس سے) عربی زبان میں تانبے کی اعلیٰ قسم کو کہتے ہیں۔ اس جزیرے کے اندر یہ دھات کثرت سے پائی جاتی ہے اس لیے عربوں نے اس کا نام ہی قُبرُص رکھ دیا۔ قبرص بحر متوسط کے مشرق میں واقع ہے۔ ترکی سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر ہے اور شام سے ۶۰ میل۔ اس کا رقبہ ۳۵۷۲ مربع میل ہے، لمبائی شرقاً غرباً ۱۴۰ میل اور چوڑائی شمالاً جنوباً ۶۰ میل ہے۔

حضرت اُمِّ حرام رضی اللہ عنہا کی آرزو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں شرمندۂ تعبیر ہوئی۔ اسلامی فوج نے سمندر عبور کر کے اس جزیرہ پر لشکر کشی کی اور ۶۴۷ء میں یہ جزیرہ اسلامی قلمرو کے تابع ہو گیا۔ حضرت اُمِّ حرام اس فوج میں اپنے خاوند حضرت عُبادہ بن صامت کے ہمراہ شریک ہوئیں قُبرُص کے ساحل پر اُتری تھیں کہ سواری بدک جانے کی وجہ سے گر کر شہید ہو گئیں اور سرزمین قبرص کی آغوش میں چلی گئیں۔ آج تک آپؓ کی قبر اس جزیرے پر پہلی اسلامی فتح کے نقوشِ زریں کی یاد دلا رہی ہے۔

قدیم زمانے میں یہ جزیرہ یونانیوں اور فینیقیوں کے قبضہ میں رہا۔ ان کے بعد اشوریوں اور مصریوں نے اس پر حکمرانی کی پھر اہلِ فارس کے زیرِ نگیں ہوا۔ ان کے ہاتھوں سے نکل کر رومیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اسلام کے داخلہ سے قبل وہاں بازنطینیوں کا تسلّط تھا۔ ۶۴۷ء میں جب پہلی مرتبہ وہاں لشکرِ اسلام نے قدم رکھا تو بازنطینی طاقت نے سخت مزاحمت کی۔ دو سال تک (۶۴۷ء ۶۴۹ء) اسلامی حکومت کے تحت رہنے کے بعد اس پر دوبارہ بازنطینیوں کا غلبہ ہو گیا۔ ۶۵۳ء میں اس پر پھر اسلامی افواج نے چڑھائی کی۔ اہلِ قُبرُص نے ایک مقررہ مقدار پر خراج کے عوض حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے عہدِ ذمّہ استوار کر لیا اور پھر رُبع صدی سے زیادہ تک وہاں اسلامی پرچم لہراتا رہا۔ عباسی دور میں جب عبدالملک بن صالح سرحدی علاقوں کا گورنر تھا تو اس جزیرہ کے باشندے رومیوں کے مسلسل دباؤ اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اسلامی سلطنت سے بدعہدی پر اُتر آئے۔ عبدالملک بن صالح نے فقہائے اسلام کے سامنے یہ صورتِ حال رکھی اور فتویٰ دریافت کیا کہ کیا ان کی بدعہدی کے پیشِ نظر ان پر چڑھائی کی جائے؟ امام اوزاعی، لیث بن سعد، مالک بن انس جیسے ائمہ کبار کے فتاویٰ کی روشنی میں عبدالملک بن صالح نے جزیرہ کے فتنہ پرداز گروہ کو اصلاحِ احوال کی مہلت دی۔ مگر اسلامی حکومت کی خیر خواہانہ کوششوں کے باوجود رومی برابر سازشیں کرتے رہے اور بازنطینی بحری بیڑا پے در پے حملے کرتا رہا جس کی وجہ سے اسلامی اثرات کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے گئے۔ اور عرصۂ دراز تک داخلی اور خارجی طالع آزماؤں کا دور دورہ رہا۔

انگریز مصنف ولبرڈ (WILLIBARD) نے ۷۲۲ء میں قبرص کی سیاحت کے بعد یہ تاثرات

لکھے کہ "قبرص اس وقت عرب اور یونانی نفوذ کے درمیان کشمکش کی آماجگاہ بنا ہُوا ہے۔ جزیرہ کے اندر مسلمانوں کے استقرار کو ختم کرنے کے لیے بازنطینی بحری بیڑے نے بھرپور طاقت استعمال کی ہے۔ بایں ہمہ اسے شکست مسلسل کا سامنا ہے۔" ڈھائی صدیوں تک اسلام کا وجود اس جزیرے کے اندر اسی کشمکش میں رہا۔ اور بالآخر ۹۶۵ء میں نیقفورس دوم فوکس (NICEPHORUS II PHOCUS) نے مسلمانوں کے ساتھ غدّاری کی اور بازنطینیوں کی صدیوں کی آرزو کو پُورا کر دیا۔ اس کے بعد یہ جزیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے کلیتہً نکل گیا۔ مسلم آبادی کو وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا اور تقریباً ۶ صدیوں تک یہ خطّۂ زمین اسلام کی حیات افروز شعاعوں سے محروم رہا۔ اس زمانہ میں وینس اور جینوا کی تہذیب وہاں کے سیاہ و سفید کی مالک رہی۔

۱۵۷۱ء میں عثمانی ترکوں کے ہاتھوں یہ جزیرہ ایک مرتبہ پھر نورِ اسلام سے منوّر ہُوا اور دلاورِ عثمانی فوجوں نے اسے عیسائیوں کے پنجہ سے آزاد کروایا۔ اس سے پہلے ترکوں کی شمشیر خارا شکن کے سامنے بلغاریہ، مقدونیہ، تسالیہ (تھسلی)، تراقیہ (تھریس)، نواحِ قسطنطنیہ، خلقیدونہ (ایشیائے کوچک)، البانیہ، بوسنہ (یوگوسلاویہ)، سرویہ اور ہنگری سرنگوں ہو چکے تھے۔ اس جزیرے کے اسلامی قلمرو میں دوبارہ شامل ہو جانے کے بعد اب کوئی طاقت ایسی نہ رہی جو عثمانیوں کی مزاحمت کر سکتی۔ اور جب سلیمان دوم مسندِ خلافت پر متمکن ہُوا (۱۶۸۹ء - ۱۶۹۱ء) تو بحرِ ایجہ (ایجینہ) اسلامی سمندر بن چکا تھا جس کے ہر ساحل پر اذانیں گونجتی تھیں اور اسلام کے عَلَم لہراتے تھے۔

۱۸۷۸ء تک یہ جزیرہ براہِ راست عثمانی سلطنت کے تحت رہا۔ اس جزیرے کی یہ تین صدیاں اس کی تاریخ کا نہایت روشن باب ہیں۔ ۱۵۷۰ء میں جب عثمانی ترکوں نے اس جزیرے کو رومیوں سے بحال کرایا اور بُندقیہ (وینس) کو بالآخر آلِ عثمان کا اقتدار تسلیم کرنا پڑا تو اس کے بعد یہ جزیرہ صحیح معنوں میں ایک اسلامی حکومت کی صورت اختیار کر گیا۔ فساد و ظلم کی جگہ امن و عدل کی بہار آ گئی۔ افلاس اور مسکنت کا خاتمہ ہو گیا اور خوشحالی اور رفاہیت کا دور دورہ ہو گیا۔ رومیوں کے سیاسی جبر، مذہبی تاریک خیالی اور معاشرتی عدمِ مساوات نے قبرصی عوام کا ناطقہ تنگ کر رکھا تھا مگر عثمانیوں کی رواداری

علم دوستی، عدل گستری اور غیر معمولی اسلامی لگاؤ نے اُن کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ عثمانیوں نے زمامِ اقتدار ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے یہ کام کیا کہ پُورے جزیرے کے اندر غلامی کو منسوخ کر کے تمام غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اور دوسرا کام یہ کیا کہ آرتھوڈکس کلیسا کو بحال کر دیا جسے میخائیل کیرولاریوس (۱۰۵۴ء) کے عہد میں کیتھولک کلیسا نے بددین قرار دے کر منسوخ کر دیا تھا۔[1] قبرص کی مسیحی آبادی کو شخصی قوانین پر عملدرآمد کرنے کی کھلی آزادی دے دی۔ اور مغرب کے کبر پرست عیسائیوں کی مذہبی آمریت سے مشرق کے عیسائیوں کو نجات دلائی۔ عثمانیوں کا یہ وہ کارنامہ ہے جسے مسیحی دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں جب عثمانی سلطنت پر ادبار کی گھٹائیں چھا رہی تھیں تو برطانیہ کی حرص و آز کی نگاہیں اس جزیرے کو ہڑپ کرنے کے لیے موقع کی تلاش کر رہی تھیں۔ چنانچہ زار روس نے جب اناضول (مشرقی صوبے) پر لشکر کشی کا خطرہ پیدا کیا تو موقع پرست برطانیہ نے فوراً آستانہ سے ربط قائم کیا اور سلطان کو یہ پیش کش کی کہ اگر سلطان قبرص کو برطانوی حکومت کے حوالے کر دے تو برطانیہ اس کے عوض سلطان کو فوجی مدد دے گا اور روسی نفوذ کا سدِ باب کرے گا۔ سلطان نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ ۴ جون ۱۸۷۸ء کو اس دفاعی معاہدے پر دستخط ہو گئے جس میں یہ واضح طور پر تحریر تھا کہ جزیرے کا نظم و نسق اگرچہ برطانیہ کی نگرانی میں ہو گا مگر یہ جزیرہ قانونی لحاظ سے خلافتِ عثمانیہ کا غیر منفک جز رہے گا۔ برطانیہ کے اقتدار کے بعد یہ جزیرہ عیسائیوں سے زیادہ یہودیوں کے فروغ کی آماجگاہ بن گیا۔ کیونکہ اس وقت برطانیہ کا وزیر اعظم اگرچہ عیسائی تھا مگر درحقیقت اس کی تمام تر ہمدردیاں یہودیوں کی صہیونی تحریک سے تھیں۔ اور اُس کی رُوح ہمیشہ یہود کے اِردگرد منڈلاتی رہتی تھی۔[2] یہودیوں نے اس جزیرہ کو بین الاقوامی تجارتی اڈے میں تبدیل کر دیا اور یونانیوں اور یہودیوں کو اس میں لا کر آباد کرنا شروع کر دیا۔ نتیجۃً آہستہ آہستہ مسلمان آبادی کا قافیہ تنگ ہونا شروع ہو گیا اور عملاً یہ جزیرہ دولتِ عثمانیہ سے الگ تھلگ ہو کر رہ گیا۔

۱۸۹۲ء میں مولانا شبلی مرحوم نے اس جزیرہ کی سیاحت کی ہے۔ انگریزوں کی عملداری کے باوجود اس

---

[1] دیکھیے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۶ ص ۹۵۳۔ قبرص کے موجودہ صدر میکاریوس کو اسی کلیسا کی طرف سے لارڈ بشپ کا منصب ملا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو کتاب: "دنیائے یہود کی بیداری" تالیف صدر رسو کولو۔

جزیرے میں مسلمانوں کی حالت بہت اچھی تھی۔ دینی تعلیم کا بہت رواج تھا اور نہایت معیاری درسگاہیں کتاب وسُنّت کے نغموں سے گونج رہی تھیں۔ شرعی عدالتیں قائم تھیں جن میں مسلمانوں کے شخصی مقدمات کا شریعت اسلامی کی رُو سے فیصلہ ہوتا تھا۔ لوگوں کی زبان ترکی تھی یہاں تک کہ عیسائی آبادی بھی بے تکلف ترکی زبان بولتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ عوام کو اس کا پُورا پُورا احساس تھا کہ انگریزوں نے ان کی آزادی چھین رکھی ہے اور وہ سلطانِ ترکی ہی کو اپنا سربراہ تسلیم کرتے تھے۔ البتہ انگریزوں اور عیسائیوں نے سازش کے طور پر تجارت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ جزیرہ کے بڑے بڑے تجارتی مراکز اور بلند و بالا عمارات عیسائیوں کے قبضہ میں تھیں۔ وہ اس عارضی تسلّط کے ذریعہ جزیرہ کو اپنی مستقل کالونی میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ میں، جب عثمانی سلطنت جنگ کی لپیٹ میں تھی، انگریزوں نے یک طرفہ فیصلے کی رُو سے قبرص کو برٹش امپائر میں ضم کر لیا۔ اس طرح نومبر ۱۹۱۴ء کے بعد یہ جزیرہ برطانیہ کا "اٹوٹ انگ" بن گیا۔ دس سال کے بعد ۱۹۲۴ء کی لوزان کانفرنس میں ترکوں نے بھی مجبوراً اس انضمام کو تسلیم کر لیا اور اعلان کر دیا کہ: "قبرس تاج برطانیہ کا مقبوضہ ہے۔"

جنگ عظیم دوم کے بعد قبرسی یونانیوں نے، جو اس خطّے کے اصل باشندے نہ تھے بلکہ یونان سے لاکر یہاں بسائے گئے تھے تاکہ مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کیا جاسکے، قبرص کو یونان کے اندر ضم کرنے کی کوشش کی، اور اپنی دہشت پسند تنظیموں کے ذریعہ سے پہلے انگریز حکام کو ہراساں کرنے کی کوشش کی اور پھر مسلمانوں کو اپنے تشدّد و تخریب پسندی کا ہدف بنا لیا کیونکہ مسلمانوں نے قبرص کو یونان کا جز قرار دینے کی مخالفت کی تھی اور ان کی اسکیم کو ناکام بنا رہے تھے۔

قُبرُص کی آزادی کی تحریک جنگ عظیم دوم سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس تحریک کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا مسلمانوں کے سر تھا۔ مگر جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں تحریک شروع ہوتے ہی عیسائیوں میں مذہبی تعصب اُبھر آیا اور انہوں نے آزادی سے مراد قُبرُص کا یونان سے الحاق قرار دیا۔ ترک جو اقلیت میں تھے اس خطرے کو بھانپ گئے اور انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ قبرص کا اصل مالک ترکی ہے

اس لیے اس جزیرے کا الحاق اخلاقاً اور قانوناً ترکی سے ہونا چاہیے۔ اس صورت حال نے قبرص کے ترکوں کو دوگونہ مشکل سے دوچار کر دیا۔ ایک انگریزوں سے آزادی اور دوسرے قبرصی یونانیوں کی اکثریت سے نجات۔ بدقسمتی سے تحریکِ آزادی کے دوران ۱۹۵۱ء میں قبرصی کلیسا (آرتھوڈکس) نے میکاریوس کو کلیسا کا آرچ بشپ منتخب کر لیا۔ اس مکار پادری نے مذہبی لبادے کی آڑ میں آگ اور خون کا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک طرف عیسائیوں کے مذہبی تعصب کو خوب بھڑکایا اور دوسری طرف یونان کی دہشت پسند تنظیم ایوکا اور اُس کے سفاک لیڈر جنرل گریواس کی خدمات حاصل کریں۔ مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کروا دیا۔ قبرصی ترکوں اور قبرصی یونانیوں کے درمیان نہ ٹلنے والی عداوت کے بیج بو دیئے۔ اور اس جزیرے کے امن کو ہمیشہ کے لیے خطرات کی دستبرد میں دے دیا۔

اگست ۱۹۶۰ء میں ۸۲ سال کے بعد اقتدار انگریزوں کے ہاتھ سے نکل کر جزیرے کے باشندوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ لیکن انتقالِ اقتدار سے پہلے جزیرے کی دونوں قوموں کے درمیان اُسی نوعیت کی شدید منافرت اور کشاکش کے بادل چھا چکے تھے جیسے برعظیم ہند کی تقسیم کے وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تھے۔ چنانچہ اسی تلخ حقیقت کے پیشِ نظر قبرص کی ترک آبادی انتقالِ اقتدار سے قبل ہی اس مطالبہ پر متفق ہو چکی تھی کہ ہندوستان کی طرح قبرص کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ مگر اُن کا یہ مطالبہ انگریز کی ڈپلومیسی کے سامنے صدا بصحرا ثابت ہُوا اور اُن کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہو گیا۔

اس مفصل تاریخی پس منظر کے بعد اب قبرص کے اصل مسئلہ کے چند پہلوؤں پر غور کیجیے:

قبرص کی آزادی کے معاہدہ میں قبرص کے آئین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے قبرص ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے جس کا نظامِ حکومت صدارتی ہے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں کو اپنی اپنی زبان میں کاروبار چلانے کا حق ہے۔ انتظامی اختیارات عیسائی صدر مکاریوس اور مسلمان نائب صدر ڈاکٹر فاضل کوچک کو مشترکہ طور پر حاصل ہیں۔ ملک کے ایوان نمایندگان میں عیسائیوں کے لیے ۷۰ فیصد اور مسلمانوں کے لیے ۳۰ فیصد نشستیں مقرر ہیں۔ فوج اور پولیس پر صدر اور

نائب صدر کا مشترکہ کنٹرول ہے۔ نائب صدر کو ہر معاملے اور ہر قانون کے خلاف حق تنسیخ حاصل ہے۔ آزادی کے وقت قبرص نے ترکی، برطانیہ اور یونان سے معاہدہ کیا تھا جس کی رُو سے آئین کی پابندی کی ضمانت دی گئی تھی۔

یہ آئین ایک طرف پوری طرح مسلمانوں کے تحفظ کا ضامن ہے اور دوسری طرف صدر مکاریوس کے ان عزائم کی راہ میں بھی حائل ہوتا ہے کہ قبرص کو یونان میں شامل کر دیا جائے۔ اس مکّار پادری نے اس مشکل کو حل کرنے کے لیے آئین میں بجبر ترمیم کرنے کی تحریک چلا رکھی ہے۔ اس سلسلے میں اُس نے متعدّد اقدامات کیے ہیں مثلاً ۱۹۶۱ء میں اُس نے جُداگانہ بلدیاتی اداروں کو ختم کر دینے کی تجاویز پیش کیں تاکہ قبرسی ترک اور قبرسی یونانیوں کا امتیاز ختم کر دیا جائے اور قبرسی ترکوں کی اقلیت کو عیسائی اکثریت کے اندر تحلیل کر دیا جائے۔ ڈاکٹر فاضل کوچک نے اس تجویز کو مسترد کر دیا اور جب معاملہ عدالت تک پہنچا تو عدالت نے بھی مکاریوس کے دعویٰ کو ردّ کر دیا۔ اگست ۱۹۶۳ء میں اس نے دوبارہ یہ سازش شروع کر دی۔ اُس نے اعلان کیا کہ وہ آئین کو ازسرِ نو مدوّن کرنا چاہتا ہے جس میں صدر اور نائب صدر کا حق تنسیخ ختم کر دیا جائے گا۔ عیسائی اور مسلمان بلدیات کی تفریق مٹا دی جائے گی۔ اور انتظامیہ میں مسلم نمایندگی کا تناسب ۳۰ فیصد سے گھٹا کر ۸ فیصد کر دیا جائے گا۔ ڈاکٹر فاضل کوچک نے اعلان کیا کہ اگر مکاریوس نے یک طرفہ طور پر آئین بدل دیا تو مسلمان عدم تعاون کی تحریک شروع کر دیں گے۔ مکاریوس کی ہٹ دھرمی نے جب تبدیلِ آئین کی اسکیم پر عمل درآمد شروع کیا تو مسلمانوں نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا جس کے نتیجے میں انہیں مکاریوس اور متعصب عیسائیوں اور یونانی غنڈوں کے ہاتھوں آگ اور خون کی ہولی کھیلنا پڑی اور ابھی تک کھیل رہے ہیں۔

مکاریوس کی ان تمام سازشوں، فساد انگیزیوں اور مسلم کُش منصوبوں کا مدعا یہ ہے کہ قبرص میں ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ کسی مسلمان کا وجود جزیرے کے اندر باقی رہنا مُشکل ہو جائے اور بالآخر یونان سے اس کا کلیتہً الحاق ہو جائے۔ ۴ ستمبر ۱۹۶۲ء میں باتابہ نامی مقام پر اُس نے

تقریر کرتے ہوئے صاف کہا: "ایوکا تنظیم کی مہم اس وقت تک ختم نہیں سمجھی جاسکتی جب تک وہ قبرص کی حقیر ترک اقلیت کو پوری طرح سمندر کی نذر نہیں کر دیتی۔ اس اقلیت کا نسب اُس ترک نسل سے جاکر ملتا ہے جو تاریخ کے ہر موڑ پر یونانی نسل کی مستقل دشمن رہی ہے۔" ایوکا تنظیم یونان کی دہشت پسند تنظیم ہے جسے آرتھوڈکس کے متعصب عیسائی چلا رہے ہیں۔ اس تنظیم کا سربراہ رسوائے عالم شخص گریواس ہے۔ یہ تنظیم تعصّب، غنڈہ گردی، سفّاکی اور مسلم دشمنی میں اُسی درجے کی ہے جس درجے کی جن سنگھ تنظیم ہے۔

مکاریوس کی اصل پشت پناہ طاقت حکومت یونان ہے۔ ۶۰ء کے معاہدۂ آزادی کی رُو سے اگرچہ یونان پر لازم ہے کہ وہ مکاریوس کو دستور کی پابندی پر مجبور کرے مگر اس کے برعکس یہ حکومت اس بین الاقوامی ضابطے کی خلاف ورزی کر رہی ہے اور مکاریوس کی فتنہ پردازیوں سے تعاون کر رہی ہے۔ حکومتِ یونان نے اپنی باقاعدہ فوج کے دس ہزار افراد قبرص بھیج رکھے ہیں تاکہ وہ قبرسی عیسائیوں کے ساتھ مل کر مسلم آبادی کو نیست و نابود کرنے میں مدد دے سکیں۔ اور معاہدۂ اٹلانٹک کے تحت حاصل ہونے والا اسلحہ بیشتر یونان سے قبرص پہنچ رہا ہے جسے قبرص کی مشرقی بندرگاہ فاماگستا (FAMAGUSTA) پر اتارا جاتا ہے۔ ڈیلی ٹیلی گراف نے ۱۵ فروری ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ "قبرص میں گزشتہ ۲ ماہ کے اندر ۴۰ ہزار ہتھیار ناجائز طور پر داخل کیے گئے ہیں۔" اقوامِ متحدہ کے جنرل سیکرٹری نے اپنی ۱۰ ستمبر ۱۹۶۴ء کی رپورٹ میں بھی اس سازش کا انکشاف کیا ہے۔ یونان قبرص پر قبضہ کرنے کا خواب عرصۂ طویل سے دیکھ رہا ہے۔ اس خواب کی تعبیر سے وہ یونان کی اُس پرانی تہذیب کا احیاء کرنا چاہتا ہے جس کے ڈانڈے اسکندر اعظم سے ملتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے یونان نے مختلف ہتھکنڈے اختیار کیے ہیں جنگِ آزادی کے دوران جب قبرسی مسلمانوں اور یونانیوں کے درمیان کشمکش برپا ہوئی تو یونان نے فوراً اینوسیس اسکیم کے نام سے یہ تجویز پیش کر دی کہ قبرص کو یونان کے ساتھ ملا دیا جائے۔ ۱۹۶۴ء میں بھی وہ اس نظریے کو دُہرا چکا ہے۔ یونان کے وزیر اعظم پاپاندریو نے ۲۷ اکتوبر کو سیلانیک

(سالونیکا) میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا ہے: "اینوسیس اسکیم کی کامیابی کے بعد قبرص کا تاریخی رُخ اسکندر اعظم کے راستہ کی طرف ہوگا۔" اس اعلان کے ایک ہفتہ بعد صدر مکاریوس نے بھی یہ تصریح کردی کہ "میری تمام تر جدوجہد اینوسیس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے وقف ہے۔ یہ نظریہ کبھی بھی میری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہا۔ قبرص کا مسئلہ اگرچہ متعدد مرحلوں سے گزرا ہے مگر اس کے جوہری نظریے میں کبھی تغیر نہیں آیا۔ اینوسیس اسکیم کی کامیابی اور حدودِ یونان کی شمالی افریقہ تک توسیع میری دیرینہ آرزو ہے۔ اس ارادے کی تکمیل کے لیے میری جدوجہد برابر جاری رہے گی۔"

حکومتِ یونان اور قبرص کے صدر لارڈ بشپ مکاریوس کا یہ نظریہ نئے پروگرام کے ساتھ ۱۹۶۳ء کے اواخر سے قبرص کے ترکوں کو خون کے دریا میں نہلا رہا ہے۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۶۳ء کو دارالحکومت نیقوسیا میں جب مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کردیا گیا تو برطانوی اخبار گارڈین نے لکھا کہ "مسلمانوں کے قتلِ عام کے لیے آج سے دو سال قبل تیاریاں شروع کردی گئی تھیں اور ایک خفیہ کمیٹی قائم ہو گئی تھی جسے فوج کی کمان سونپ دی گئی تھی۔" نیقوسیا کے بعد دوسرے شہروں کی مسلم آبادی بھی یکایک غنڈہ گردوں کے ہاتھوں ہنگامہ ہائے دار و گیر اور ولولہ ہائے رستاخیز سے دوچار ہوگئی۔ اور آخر کار ۲۵ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ترکی کی فضائی فوج نے نیقوسیا پر پرواز کی اور مظلوم مسلمانوں کو وحشت و درندگی کے ہاتھ سے کسی قدر نجات ملی۔ اس ایک ہفتہ کی لڑائی میں ۹۹ مسلمان شہید ۴۷۰ زخمی اور ۱۵۴ لاپتہ ہوئے۔ مجموعی طور پر مسلمانوں کا جو نقصان ہوا اُس کی تفصیل اقوامِ متحدہ کے جنرل سکرٹری کی ۱۰ ستمبر ۱۹۶۴ء کی رپورٹ کی رُو سے یہ ہے: ترکوں کے ۵۲۷ گھر بالکل مسمار کردیے گئے ہیں، ۲ ہزار مکانات کو شدید نقصان پہنچا ہے، یہ تباہی جزیرہ کی ۱۰۹ بستیوں کے اندر ہوئی ہے۔ ۴ ہزار ترک ملازموں کو سرکاری خدمات سے سبکدوش کردیا گیا ہے۔ ۲۵ ہزار ترکوں کو اپنے شہروں اور بستیوں سے جبراً بیدخل کیا گیا ہے۔ ۵۶ ہزار افراد انجمن ہلال احمر کے دست نگر ہوچکے ہیں۔ ان میں سے ۲۵ ہزار وہ ہیں جو گھروں سے بے گھر ہوگئے ہیں۔ ۲۳ ہزار

۵ سو وہ ہیں جو بے روزگار ہو گئے ہیں اور ، ہزار ۵ سو وہ ہیں جن کے رشتہ دار اس جنگ میں لاپتہ ہو گئے ہیں۔ ترک آبادی کی جس طرح شدید اقتصادی ناکہ بندی کی گئی ہے اُس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قبرص کی یونان پسند حکومت اس مسئلے کا حل اقتصادی دباؤ کے ذریعہ کرنا چاہتی ہے۔"

یونانی غنڈوں کی غارت گری برابر جاری ہے۔ اب تک ترک مسلمانوں کی نصف آبادی کا انخلاء کیا جا چکا ہے۔ ان کے گھروں کو بُری طرح لوٹا جا رہا ہے۔ گزشتہ سال ۲۸ لاکھ روپے کی مالیت کی گندم، ۳۰ لاکھ روپے سے زائد مالیت کا انگور اور انجیر اور ۶۳ لاکھ روپے کی مالیت کی سبزیاں لوٹ لی گئی ہیں یا چوری ہو گئی ہیں۔ تمام بندرگاہوں اور درآمدی مراکز پر یونانی غنڈوں کا قبضہ ہے اور سرکاری طور پر کوئی ترک درآمدی کاروبار نہیں کر سکتا۔ ترک آبادی فاقوں مر رہی ہے۔ باہر سے جو اعانت و امداد اُسے بھیجی جا رہی ہے وہ ان تک پہنچنے نہیں دی جاتی۔ ترکی کی انجمن ہلال احمر نے مختلف اقسام کا جو ۹۴۶ ٹن سامان روانہ کیا تھا وہ بھوک سے بلکتے بچوں اور فاقہ کش مردوں اور عورتوں تک پہنچنے نہیں دیا گیا۔ یہ سامان ابھی تک گوداموں میں پڑا سڑ رہا ہے۔ یونانیوں نے متعدد مساجد کو شہید اور بے شمار مساجد کو مقفل کر دیا ہے۔ کئی مسجدوں کو گرجاؤں میں تبدیل کیا جا چکا ہے۔ قبرص کی مشہور بمبی مسجد جو اوقاف کے زیر انتظام تھی منہدم کر دی گئی ہے اور وہاں مترک تعمیر کر دی گئی ہے۔

یونانی عیسائیوں اور مسلمان ترکوں کی یہ جنگ سیاسی اور اقتصادی سے زیادہ مذہبی نوعیت کی ہے۔ میکاریوس مسلمانوں کے قتلِ عام کے لیے جو اسلحہ وغیرہ خریدتا ہے اُس کے لیے وہ چندہ کی اپیل خالص مذہبی بنیادوں پر کرتا ہے۔ ایک طرف وہ قبرص کا صدر ہے اور ایک ایسی ریاست کا سربراہ ہے جس کی ۶ لاکھ کی آبادی میں ۱۸ فیصد مسلمان ہیں اور ۴ فیصد دوسری غیر مسیحی اقوام ہیں۔ اور دوسری طرف وہ آرتھوڈکس چرچ کی طرف سے لارڈ بشپ کا عہدہ بھی سنبھالے ہوئے ہے۔ اور اُس کی کار پر جو پلیٹ نصب ہے وہ "صدر جمہوریہ قبرص" کی نہیں بلکہ "قبرص کے لارڈ بشپ"

کی ہے۔

امریکہ کے لوگوں کا عام اندازِ فکر قبرص کی مسلمان آبادی کے معاملہ میں جو کچھ ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک مثال کافی ہے۔ جن قبرصی مسلمانوں نے اپنے دفاع میں جانیں دی ہیں اُن کے بارے میں امریکی جریدہ لائف لکھتا ہے: "لاشیں پڑی ہیں، ان پر کوئی کفن نہیں ہے، نہ ان کے مذہبی مراسم ادا کیے گئے ہیں کیونکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو مسلمان جہاد میں شہید ہو جائے وہ آٹو میٹک جنت میں داخل ہو جاتا ہے، اُس پہ دعا پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی"۔ عیسائیت کے تعصب کی یہ برہنہ تصویر ہے۔

دوسری طرف قبرص اور ترکی کے مسلمان بھی پورے دینی جذبہ سے اس ظلم کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے محض قومی و وطنی جذبہ سے نہیں بلکہ اسلام کے وجود کے تحفظ کے جذبے سے قبرصی عیسائیوں اور غنڈوں کا مقابلہ کیا ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جو عیسائی اقوام کے لیے سوہانِ رُوح بن رہا ہے۔ کل قبرص کی سرزمین میں وہ اس جذبے کا رنگ دیکھ چکی ہے۔ آج پاکستان اور کشمیر کی سرحدوں نے اسی جذبے کا عکس اُن کے سامنے پیش کیا ہے۔ اور وہ دن دُور نہیں جب عالمِ اسلام کے چپّے چپّے سے وہ اسی جذبے کی صدا گونجتی ہوئی سنیں گی۔ سوئٹزرلینڈ کے روزنامے ٹریبیون ڈی جنیوا کے سیاسی تبصرہ نگار جان جاک چوئیٹ نے اسی راز کو بے نقاب کرتے ہوئے لکھا ہے: "ترک قوم سیاسی لیڈر مکاریوس اور آرتھوڈکس چرچ کے سربراہ مکاریوس میں کوئی تفریق نہیں کرتی۔ انہیں وہ تلخ کردار ابھی تک یاد ہے جس کا مظاہرہ ماضی میں اکلیروس اُن کے ساتھ کر چکا ہے۔ انہیں یہ بھی پوری طرح معلوم ہے کہ قبرص کی ترک اقلیت جن مصائب میں زندگی بسر کر رہی ہے اُس کی تہ میں مذہبی عوامل کام کر رہے ہیں۔ ترکوں سے یہ حقیقت بھی اوجھل نہیں ہے کہ قبرص کا چرچ عین اس وقت بلغاریہ کے چرچ کو دعوت نامہ جاری کر رہا تھا جب صوفیا کی حکومت بلغاریہ کے ۹ لاکھ مسلمان ترکوں کی جلاوطنی کے احکام جاری کر رہی تھی۔ علاوہ بریں جزیرہ قبرص کا صلیبی جنگوں میں بھی خاص کردار رہا ہے۔ صلیبی جنگوں کا آغاز ہی اس وقت ہوا جب قبرص صلیبی جنگوں کا مضبوط مرکز بن گیا تھا۔ خود مغربی مصنفین کی

شہادتیں موجود ہیں کہ قبرص نے صلیبی ذہن کو پروان چڑھانے اور صلیبی آگ کو بھڑکانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ بلکہ ایسے صلیبی بادشاہ گزرے ہیں جو بیک وقت قبرص اور بیت المقدس کے تختِ بادشاہت پر متمکن رہے ہیں۔ مثلاً امالرک دوم (AMALRIC II) اور ہیوگ سوم (HUGH III) ۔ اور اب آثار یہ بتا رہے ہیں کہ قبرص اور یونان کا آرتھوڈکس چرچ اسی ذہن کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے یونان اور قبرص کو وہی حیثیت دینا چاہتا ہے جو صلیبی جنگوں کے دور میں تھی"۔

مسئلۂ قبرص میں یونان کا موقف تو صاف واضح ہے۔ اس مسئلہ کا دوسرا فریق برطانیہ ہے معاہدۂ آزادی کی رُو سے برطانیہ کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ مکاریوس کی شر انگیزی کا قلع قمع کرتا۔ مگر برطانیہ نے اس معاملے میں بھی وہی منافقانہ روش اختیار کی ہے جو اس کا طرۂ امتیاز بن چکی ہے۔ مذہبی لحاظ سے برطانیہ کی دلچسپیاں ترکوں سے ہرگز نہیں ہو سکتیں۔ چرچ آف انگلینڈ اور آرتھوڈکس اگر مذہبی روایات میں باہمی اختلاف بھی رکھتے ہوں تو وہ اسلام دشمنی میں یقیناً متحد ہیں۔ اسی طرح سیاسی لحاظ سے بھی برطانیہ قبرصی یونانیوں کو ترجیح دے گا۔ ایک طرف قبرص برطانوی دولت مشترکہ کا رکن ہے اور دوسری طرف برطانیہ کے دو ہوائی اڈے قبرص کے اندر موجود ہیں۔ اس لیے ظاہری چالوں کے باوجود اس فریق کا بوجھ حقیقت مکاریوس کے پلڑے میں جاتا ہے۔ ترکی حکومت نے اپنے قبرصی بھائیوں کی جو امداد کی ہے وہ ترکی کی عین اسلامی غیرت کا تقاضا ہے۔ دسمبر ۱۹۶۳ء میں جب اناضول سے صرف ۴۰ میل دور نیقوسیا کے اندر قبرصی مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں تو ترکوں کی اسلامی حمیت ان مظالم کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکی۔ فوراً ترکی کی ہوائی طاقت حرکت میں آگئی اور نیقوسیا کے اوپر اس کے جہاز پرواز کرنے لگے۔ مکار مکاریوس نے یہ صورت حال دیکھ کر فوراً جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ اس بروقت امداد کے علاوہ ترکی آج تک ان کی ہر طرح کی امداد کر رہا ہے۔ مگر مکاریوس کے علاج کے لیے مزید مؤثر اقدامات ضروری ہیں۔

عالم اسلام کی ہمدردیاں بالعموم قبرصی مسلمانوں کے ساتھ ہیں، اور خصوصیت کے ساتھ پاکستان نے مسلمانوں کے ہر مسئلے کی طرح اس مسئلے میں بھی اپنے دینی بھائیوں کی پوری حمایت کی ہے۔ مگر یہ بات

انتہائی رنج کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ صدر ناصر نے کھلم کھلا ظالم میکاریوس کا ساتھ دے کر سارے عالمِ اسلامی کو حیران کر دیا ہے ۔ یہ فعل نہ حق و انصاف کے مطابق ہے اور نہ اسلامی اخوت کے مطابق ۔

سرِدست اس مسئلہ کا صحیح حل وہی موزوں ہے جس کا مطالبہ ترک کر رہے ہیں ۔ وہ یہ ہے کہ قبرص کے اندر وفاقی نظامِ حکومت قائم کیا جائے ۔ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو خانہ جنگی ہو چکی ہے اور عیسائیوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو بدسلوکی کی ہے اس کی وجہ سے اب ان دونوں قوموں کا کسی وحدت کے اندر رہنا محال ہے ۔ گزشتہ مظالم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ترک اقلیت کی جان و مال اور عزت و آبرو قبرصی یونانیوں کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہے ۔ اس لیے دونوں آبادیوں کو الگ الگ صوبے قرار دے کر انہیں ایک بالاتر وفاقی مرکز کے تحت کر دیا جائے ۔ البتہ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ مسلمان ممالک کا خواہ کوئی مسئلہ بھی ہو، کشمیر ہو یا قبرص، فلسطین ہو یا اری ٹیریا، اس وقت تک حل نہیں ہو گا جب تک مسلمان اقوام اپنا جداگانہ بلاک نہیں تشکیل دیتیں اور جب تک ملتِ اسلامیہ کو پوری طرح جذبۂ جہاد سے سرشار نہیں کیا جاتا ۔